تدبرِ قرآن

۸۱

التکویر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سے تعلق

پچھلی دونوں توام سورتوں ——— النّٰزعٰت اور عبس ——— میں جس ہولِ قیامت سے 'طَآمَّۃ' اور 'صَآخَّۃ' کے ناموں سے ڈرایا گیا ہے اس سورہ میں اسی ہول کی پوری تصویر ہے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں پھر انسان کے قریب و بعید اور اس کے ظاہر و باطن کے ہر گوشہ میں اس ہلچل کے جو اثرات مترتب ہوں گے وہ اس طرح نگاہوں کے سامنے کر دیے گئے ہیں کہ انسان اگر سوچنے سمجھنے والا ہو تو ان آیات کے آئینے میں وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے جو ابھی پس پردہ ہے لیکن ایک دن وہ سب اس کے سامنے آنے والا ہے۔

اس کے بعد قریش کے مکذبین کو مخاطب کر کے آگاہ کیا گیا ہے کہ قرآن اس دن سے جو تمہیں ڈرا رہا ہے تو اس کو ایک حقیقت سمجھو اور اس کے لیے تیاری کرو۔ یہ خدا کا نازل کردہ کلام ہے جو اس نے اپنے سب سے مقرّب و معتمد فرشتے کے ذریعہ سے اپنے رسول پر اتارا ہے۔ اگر تم نے اس کو کاہنوں کی کہانت اور شاعروں کی شاعری سمجھ کر رد کر دیا تو یاد رکھو کہ نہ خدا کا کچھ بگاڑو گے نہ رسول کا بلکہ اپنی ہی تباہی کا سامان کرو گے۔ رسول کا کام لوگوں تک اس یاد دہانی کو پہنچا دینا ہے۔ اس کے بعد ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ اس پر ایمان لانے کی توفیق انہی کو حاصل ہو گی جو حق کے قدردان اور اس کے طالب ہوں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے :

پہلے چھ آیتوں میں وہ احوال بیان ہوئے ہیں جو مردوں کو زندہ کیے جانے سے پہلے پیش آئیں گے۔

(۱-۳) اس کائنات کی بلند و بالا اور عظیم و پرشوکت چیزوں مثلاً سورج، چاند اور پہاڑوں کا اس دن جو حال ہو گا اس کی تصویر۔

(۴-۶) زمین کی ہر چیز پر اس دن نفسی نفسی کی جو حالت طاری ہوگی اس کا اجمالی بیان ۔ محبوب ترین چیزیں چھوٹی پھریں گی لیکن ان کا کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا ۔ جنگلوں اور غاروں کے وحوش و بہائم سمندروں کی طغیانی سے فرار کے لیے اکٹھے ہو جائیں گے، شیر اور ہرن دونوں پاس پاس ہوں گے لیکن مشترک مصیبت کے سوا ان کو اور کسی چیز کا بھی کچھ ہوش نہ ہوگا ۔

اس کے بعد آٹھ آیتوں میں وہ احوال بیان ہوئے ہیں جو اٹھائے جانے کے بعد مشاہدہ میں آئیں گے ۔

(۷-۱۴) انسانوں کی ان کے عقائد و اعمال کے اعتبار سے درجہ بندی اور معصوم مظلوموں کی دادرسی ہوگی ۔ لوگوں کے اعمالنامے کھلیں گے ۔ آسمان سرخ ہو جائے گا، جہنم دھکائی جائے گی جنت اپنے حق داروں کے قریب لائی جائے گی اور ہر ایک اس دن دیکھ لے گا کہ وہ اپنے رب کے حضور کیا نذرانے کر آیا ہے ۔

(۱۵-۲۱) ستاروں کے ٹوٹنے اور شب کی تاریکی کے بعد صبح کے نمودار ہونے سے اس بات پر شہادت کہ یہ قرآن کاہنوں کی خرافات کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ خدا کے ایک جلیل القدر فرشتے کا لایا ہوا کلام ہے جو عرش والے کے نزدیک بڑا ہی باعزت و با اقتدار ہے ۔ تمام ملائکہ اس کی اطاعت کرتے ہیں ۔ وہ نہایت معتمد اور امانت دار ہے ۔

(۲۲-۲۶) قرآن کے مکذبین کو تنبیہ کہ جو رسول تم کو یہ کلام سنا رہا ہے وہ کوئی خبطی و دیوانہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا رسول اور نہایت فرزانہ ہے ۔ وہ جس فرشتہ سے اپنی ملاقات کا دعویٰ کر رہا ہے یہ کوئی وہم نہیں بلکہ بیانِ حقیقت ہے ۔ اس نے اس فرشتہ کو بالکل کھلے افق میں دیکھا ہے ۔ وہ غیب دانی کا حریص نہیں ہے بلکہ اس پر جو وحی آتی ہے وہ بالکل غیر ارادی طور پر مبدأ فیض سے نازل ہوتی ہے ۔ نادان ہیں جو اس کے کلام کو کسی شیطانِ رجیم کا القاء سمجھتے ہیں اور اس کے انذار کو جھٹلا رہے ہیں ۔

(۲۷-۲۹) مکذبین کو مزید تنبیہ کہ اگر اسی طرح اپنی ضد پر اڑے رہ گئے تو یاد رکھو کہ نہ اللہ کا کچھ بگاڑو گے نہ اس کے رسول کا بلکہ اپنی ہی تباہی کا سامان کرو گے ۔ جو کلام تم کو سنایا جا رہا ہے یہ تمہارے لیے یاددہانی ہے، اس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا تمہارا اپنا کام ہے ۔ نہ رسول کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو تمہارے دلوں میں زبردستی اتار دے اور نہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ اس کو قبول کرنے پر مجبور کر دے ۔ اس کے لیے انہی کے سینے کھلیں گے جو سیدھی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ رکھنے والے ہوں گے اور یہ حوصلہ انہی کے اندر پیدا ہوگا جو سنتِ الٰہی کے مطابق اس کے سزاوار ہوں گے ۔

سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ

مَكِّيَّةٌ —— اٰيات : ۲۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ﴿۱﴾ وَإِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ﴿۲﴾ وَإِذَا الْجِبَالُ آیات ۱-۲۹
سُيِّرَتْ ﴿۳﴾ وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ﴿۴﴾ وَإِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ﴿۵﴾
وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴿۶﴾ وَإِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ﴿۷﴾ وَإِذَا الْمَوْءٗدَةُ
سُئِلَتْ ﴿۸﴾ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ﴿۹﴾ وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿۱۰﴾
وَإِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ﴿۱۱﴾ وَإِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ﴿۱۲﴾ وَإِذَا
الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ﴿۱۳﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ أَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾ فَلَآ أُقْسِمُ
بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾
وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ إِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِيْ قُوَّةٍ
عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِيْنٍ ﴿۲۱﴾ وَمَا
صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿۲۳﴾ وَمَا
هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿۲۴﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۲۵﴾
فَأَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿۲۶﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ لِمَنْ شَآءَ
مِنْكُمْ أَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿۲۸﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ

۲۹ ع ۱ ربُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۲۹

جب کہ سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ پہاڑ چلا دیے جائیں گے اور دس ماہہ گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی۔ وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر اُبل پڑیں گے۔ ۱-۶

جب کہ نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی اور زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی! جب کہ اعمال نامے کھولے جائیں گے اور آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی۔ جب کہ دوزخ بھڑکا دی جائے گی اور جنت قریب لائی جائے گی، تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ وہ کیا لے کر آئی ہے! ۷-۱۴

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے، چلنے والے اور چھپ جانے والے ستاروں کی اور رات کی جب وہ جانے لگتی ہے اور صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے کہ یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے، وہ بڑی ہی قوت والا اور عرش والے کے نزدیک بڑا ہی بارسوخ ہے۔ اس کی بات مانی جاتی اور وہ نہایت امین بھی ہے۔ ۱۵-۲۱

اور تمھارا یہ ساتھی کوئی خبطی نہیں ہے۔ اور اس نے اس کو کھلے افق میں دیکھا ہے اور یہ غیب کی باتوں کا کوئی حریص نہیں ہے اور یہ کسی شیطانِ رجیم کا القاء نہیں ہے۔ ۲۲-۲۵

تو تم کہاں کھوئے جاتے ہو! یہ تو بس عالم والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے۔ اس کے لیے جو تم میں سے سیدھی راہ اختیار کرنی چاہے اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ کہ اللہ، عالم کا خداوند چاہے۔ ۲۶-۲۹

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (۱)

'تکویر' کے معنی کسی شے کو لپیٹ دینے یا ایک گٹھڑ کی صورت میں باندھ لینے کے ہیں۔ 'کورالعمامۃ علٰی راسہٖ' کے معنی ہیں 'اس نے عمامہ اپنے سر پر لپیٹ لیا'۔

قیامت کے ظہور کے وقت آسمانوں بلکہ اس پوری کائنات کی سب سے زیادہ نمایاں اور شاندار چیز — سورج — کا جو حال ہو گا یہ اس کی تصویر ہے کہ اس کی بساط بالکل لپیٹ دی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جب سورج کی بساط ہی لپیٹ دی جائے گی تو وہ سارا عالم تیرہ و تار ہو جائے گا جو اس کی تابانی سے روشن ہے۔ اگرچہ سورج کے چھپنے کا مشاہدہ ہمیں آج بھی ہر روز ہوتا رہتا ہے لیکن اس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ یہ صورت صرف اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ہم اس سے اوٹ میں ہو جاتے ہیں البتہ جب قیامت کی ہلچل برپا ہو گی تو سورج کا سارا نظام ہی بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس تاریکی کا جب کہ سرے سے سورج ہی تاریک ہو جائے۔[۱]

قیامت کے ظہور کے وقت سورج کا حال

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (۲)

'انکدار' کے معنی دھندلے ہو جانے اور ماند پڑ جانے کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد ستاروں کا بے نور ہو جانا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب سورج ہی کی بساط لپیٹ دی جائے گی تو اس کے نظام سے وابستہ جتنے بھی بلب اور قمقمے ہیں وہ سب آپ سے آپ بے نور ہو جائیں گے۔

ستاروں کا حال

وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (۳)

آسمان کے بعد یہ زمین کی سب سے شاندار اور عظیم چیز — پہاڑوں — کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ پہاڑ جو زمینوں میں گڑے ہوئے ہیں، جن کو سمجھتے ہو کہ یہ بالکل غیر فانی اور اٹل ہیں، ان کی جگہ سے ان کو ہلایا نہیں جا سکتا، یہ اس دن چلا دیے جائیں گے۔ یہاں صرف چلا دیے جانے کا ذکر ہے لیکن دوسرے مقامات میں اس کی تفصیل بھی ہے کہ وہ اس طرح اڑتے پھریں گے جس طرح بادل اڑتے پھرتے ہیں۔

پہاڑوں کا حال

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (۴)

۱؎ یہ امر ملحوظ رہے کہ منکرینِ قیامت کو جب قیامت کی ہلچل سے ڈرایا جاتا تو وہ اس کا مذاق اڑانے کے لیے یہ سوال کرتے کہ قیامت آئے گی تو کیا وہ پہاڑوں کو بھی اکھاڑ پھینکے گی؟

محبوب چیزوں کی کس مپرسی

عِشَارُ جمع ہے عُشَرَاءُ کی۔ یہ لفظ اس اونٹنی کے لیے آتا ہے جو دس ماہ کی گابھن یعنی بچہ جننے کے قریب ہو۔

عظیم چیزوں کی بے ثباتی کے بعد یہ محبوب چیزوں کی بے وقعتی واضح فرمائی ہے کہ اس دن کی ہلچل لوگوں پر ایسی نفسی نفسی کی حالت طاری کردے گی کہ کسی کی نظروں میں اس کے محبوب سے محبوب مال کی بھی کوئی وقعت باقی نہیں رہے گی۔

یہ بات قرآن کے اولین مخاطب، اہل عرب کے خاص مذاقِ طبیعت کو پیشِ نظر رکھ کر فرمائی گئی ہے۔ ان کے مال میں سب سے زیادہ قدر کی جگہ ان کے اونٹوں کو حاصل تھی۔ خاص طور پر وہ اونٹنیاں ان کو نہایت، عزیز و محبوب ہوتیں جن کے حمل پر دس ماہ گزر چکے ہوں اور بچہ جننے کا وقت، اب قریب آلگا ہو۔ اس طرح کی اونٹنیوں کے مالک ان کی نگہداشت کا قدرتی طور پر خاص اہتمام کرتے۔ ان کی مستقبل کی بہت سی آرزوؤں کا ان پر انحصار ہوتا۔ انہی محبوب اونٹنیوں کو بطور مثال ذکر کرکے دنیا کی محبت میں پھنسے ہوئے غافلوں کو ہولِ آخرت کی یاد دہانی فرمائی ہے کہ اس کا پہلا ہی مرحلہ اتنا شدید ہوگا کہ اس وقت کسی کو اپنی محبوب سے محبوب چیزوں کا بھی کچھ ہوش نہیں رہے گا۔ گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی لیکن ان کے مالکوں کو خود اپنی اس طرح پڑی ہوگی کہ وہ کسی اور چیز کی طرف، خواہ وہ کتنی ہی محبوب و مطلوب کیوں نہ ہو، توجہ نہیں کرسکیں گے۔ یہی حقیقت دوسرے مقام تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ (الحج - ۲۲ : ۲) (جس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی) کے الفاظ سے سمجھائی گئی ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ یہاں اس دن کے ہول کی حقیقت محبوب مال کی ناقدری سے سمجھائی گئی ہے اور وہاں شفقتِ مادری کے مردہ ہوجانے سے دراںحالیکہ یہ جذبہ اتنا قوی ہے کہ اس دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کو مغلوب نہیں کرسکتی۔

وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ (۵)

وحشی جانوروں کا حال

یعنی انسان تو انسان اس دن کے ہول سے وحشی جانوروں پر بھی ایسی نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی کہ ان کو جس جگہ پناہ ملنے کی توقع ہوگی، آپس کی فطری دشمنیاں بھول کر سب اکٹھے ہوجائیں گے۔ جنگل میں آگ لگ جائے یا سیلاب کا پانی پھیل جائے تو جنگلی جانور سراسیمگی کی حالت میں جس ٹیلے اور ٹیکرے پر ان کو پناہ ملنے کی توقع ہو وہاں اکٹھے ہوجاتے ہیں اور مشترک مصیبت کا ہول ان پر ایسا طاری ہوتا ہے کہ بکری، شیر اور بھیڑیے پاس پاس کھڑے ہوتے ہیں لیکن کسی کو ہوش نہیں رہتا کہ اس کا حریف یا شکار اس کی بغل میں ہے۔ یہی صورتِ حال خوفناک ترین شکل میں ظہورِ قیامت کے وقت پیش آئے گی۔ آگے والی آیت: وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۶) (اور جب کہ سمندر ابل پڑیں گے) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سمندر اپنی حدود سے آزاد ہوکر زمین پر پھیل جائیں گے۔ یہ ہمہ گیر

مصیبت جنگلی جانوروں پر بھی نفسی نفسی کی حالت طاری کر دے گی۔

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۶)

لفظ 'تَسْجِیْرٌ' اصلاً تنور کو ایندھن سے بھر کر بھڑکا دینے کے لیے آتا ہے۔ پھر اسی مفہوم سے وسعت پا کر یہ دریاؤں اور سمندروں کی طغیانی کے لیے بھی آنے لگا۔ دریا جب بے قابو ہو کر اپنے حدود سے باہر نکل پڑیں اور زمین پر پھیل جائیں تو اس حالت کی تعبیر کے لیے یہ معروف لفظ ہے۔ اس معنی کو ادا کرنے کے لیے لفظ 'تَفْجِیْرٌ' بھی آیا ہے، چنانچہ بعد والی سورہ میں جو اس کی توام سورہ ہے، یہی بات 'وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ' (الانفطار ۸۲: ۳) کے الفاظ سے تعبیر فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ سمندر اپنے اپنے حدود کے اندر بند ہیں لیکن جب قیامت کی ہلچل برپا ہو گی تو یہ اُبل کر تمام سطح پر چھا جائیں گے۔

سمندروں کی طغیانی

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (۷)

اوپر کی آیات میں وہ احوال بیان ہوتے جو ظہورِ قیامت کے وقت پیش آئیں گے۔ اب اس آیت اور بعد کی آیات میں وہ باتیں بیان ہو رہی ہیں جن کا تعلق ظہورِ قیامت کے بعد کے احوال سے ہے۔

ظہورِ قیامت کے بعد کے احوال

فرمایا کہ جب نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی، جوڑیں ملانے سے مقصود لوگوں کی ان کے اعمال و عقائد کے اعتبار سے الگ الگ گروہ بندی ہے۔ یہ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے جس کی تفصیل سورۂ واقعہ کی آیت، 'وَکُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَۃً'[1] سے لے کر آیت ۴۴ تک بیان ہوئی ہے۔ وہاں واضح فرمایا ہے کہ اس دنیا میں تو نیک و بد دونوں ایک ہی ساتھ زندگی گزارتے ہیں لیکن یہی حالت ہمیشہ نہیں رہے گی بلکہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جب لوگوں کی درجہ بندی ان کے ایمان و اخلاق کی بنیاد پر ہو گی۔ اس دن وہ لوگ فائز المرام اور ابدی بادشاہی کے حق دار ٹھہریں گے جو اس روزِ عدل کی میزان میں پورے اتریں گے اور وہ لوگ ابدی خسران و ذلت سے دوچار ہوں گے جو اس سے بے پروا ہو کر زندگی گزاریں گے۔ اس کے بعد لوگوں کو تین بڑے گروہوں —— اصحاب الیمین، اصحاب الشمال اور سابقون و مقربون —— میں تقسیم کیا جانا بیان کیا ہے اور ہر گروہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو معاملہ ہو گا اس کی تفصیل ہے۔ اسی چیز کی طرف دو لفظوں میں یہاں اشارہ فرما دیا ہے اور مقصود لوگوں کو متنبہ فرمانا ہے کہ یہ دنیا آزمائش و امتحان کے لیے ہے۔ اس میں خیر و شر اور حق و باطل دونوں کو مہلت ملی ہوئی ہے لیکن قیامت کے بعد جو جہانِ نو پیدا ہو گا اس میں باطل

---

[1] اور اس وقت تم تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔

کے پرستار جہنم میں جھونک دیے جائیں گے اور ان لوگوں کو بڑی سرفرازی حاصل ہوگی جو امتحان میں پورے اتریں گے۔

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ (۸-۹)

معصوم مظلوموں کی دادرسی

یہ اس روزِ عدل کے عدل کی طرف اشارہ ہے اور اس کے بیان کے لیے بطور مثال زندہ درگور کی ہوئی لڑکی کی دادرسی کا حوالہ ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دن سب سے پہلے وہ معصوم اپنی مظلومیت کی داد پائیں گے جو بالکل بے گناہ ان لوگوں کے ہاتھوں ظلم کے شکار ہوئے جن کو خدا نے ان کا محافظ بنایا۔ 'مَوْءُودَةٌ' زندہ درگور کی ہوئی لڑکی کو کہتے ہیں۔ عرب جاہلیت کے بعض اجڈ قبائل میں سنگدل باپ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ بیشتر تو اس سنگ دلی کا سبب فقر کا اندیشہ ہوتا لیکن بعض حالات میں غیرت کی بے اعتدالی بھی اس کا باعث بن جاتی۔ ان مظلوم بچیوں کو زندہ درگور کرنے والے چونکہ ان کے باپ ہی ہوتے، جن کو ان کے اوپر کلی اختیار حاصل ہوتا، اس وجہ سے ان کی داد فریاد کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

اخروی عدالت کا مزاج

قرآن نے یہاں ان بے زبان مظلوموں کی دادرسی کا ذکر کر کے اخروی عدالت کا مزاج واضح فرمایا ہے کہ اس میں سب سے پہلے ان کی دادرسی ہوگی جو اس دنیا میں سب سے زیادہ بے بس اور کمزور تھے اور جو اپنے اوپر گزرے ہوئے ظلم کی کسی کے آگے فریاد بھی نہ کر سکے۔ ان کو سب سے پہلے پکارا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ انھیں کس گناہ پر مارا گیا؟ ان سنگدل باپوں کو یہ نہایت ہی سخت قسم کی تنبیہ ہے کہ اگر ان کی سنگ دلی کے خلاف یہ بے زبان و بے گناہ بچیاں فریاد نہ کر سکیں تو اس سے وہ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ خدا کے ہاں بھی ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوگا۔ اس دن اللہ تعالیٰ خود ان کے خون کا مدعی بنے گا۔ وہ ان مظلوموں سے پوچھے گا کہ تمھیں کس جرم میں مارا گیا؟ اس سوال کا مقصد ظاہر ہے کہ یہی ہوگا کہ ان کے قتلِ ناحق کا مقدمہ جو دنیا کی کسی عدالت میں نہ جا سکا اس کو رب العزت خود اپنی عدالت میں لائے اور اس کا فیصلہ فرمائے۔

وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (۱۰)

ہر ایک کا کچا چٹھا اس کے سامنے

'صُحُفٌ' سے مراد لوگوں کے اعمال نامے ہیں اور ان کے کھلے جانے سے مقصود یہ ہے کہ ہر ایک کا سارا کچا چٹھا اس کے سامنے آ جائے گا۔ آگے فرمایا ہے 'عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ' (یعنی ہر جان یہ جان لے گی کہ آج کے دن کے لیے اس نے کیا کیا)۔

وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ (۱۱)

آسمان سرخ ہو جائے گا

'كَشْطٌ' کے اصل معنی کسی چیز کے اوپر سے اس چیز کے اتار لینے کے ہیں جو اس کو ڈھانکے ہوئے ہو۔ یہیں سے یہ ذبیحہ کی کھال اتار لینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اونٹ کی کھال کھینچ لینے کے

لیے یہ عربی میں معروف لفظ ہے اور یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ ذبیحہ کی کھال اتار لینے کے بعد اس کا گوشت سرخ سرخ نظر آنے لگتا ہے۔ گویا یہ آسمان کے سرخ ہو جانے کی تعبیر ہے۔ سورۂ رحمٰن میں "فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ" (۳۷) کے الفاظ آئے ہیں اور یہاں آگے کی آیت میں جہنم کے بھڑکائے جانے کا ذکر ہے جو نہایت واضح قرینہ اس بات کا ہے کہ آسمان کی یہ سرخی جہنم کے بھڑکائے جانے کے سبب سے ہوگی۔

وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ (۱۲)

"تَسْعِيْر" کے معنی بھڑکانے اور دھکانے کے ہیں۔ جہنم تیار تو پہلے سے ہوگی لیکن جب مجرموں کو اس میں ڈالنے کا وقت آئے گا تو وہ ان کو جلانے کے لیے خاص طور پر بھڑکا دی جائے گی پھر جب مجرم اس میں ڈالے جائیں گے تو وہ اپنا مطلوب ایندھن پا کر مزید قوت سے بھڑکے گی۔

وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ (۱۳)

متقیوں کے لیے جنت کی پیشکش

"اِزْلَاف" کے معنی قریب لانے کے ہیں۔ یعنی وہ ان متقیوں کے قریب لائی جائے گی جو اس کے مستحق قرار پائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ "جنت" بھی پہلے سے تیار ہوگی، البتہ اس کی نقاب کشائی اس وقت ہوگی جب لوگوں کی درجہ بندی ہو جائے گی۔ سورۂ ق میں یہ وضاحت بھی فرما دی گئی ہے کہ اس قریب لانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ کہیں دور سے قریب لائی جائے گی، وہ دور نہیں ہوگی بلکہ پاس ہی ہوگی لیکن وہ قریب ہونے کے باوصف اور قریب لائی جائے گی تاکہ اہل جنت کی تشریف و تکریم کے لیے ایک پیشکش کے طور پر ان کے سامنے پیش کی جائے۔ فرمایا ہے: "وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ" (ق-۵۰: ۳۱) (اور جنت خدا ترسوں کے لیے قریب لائی جائے گی درآنحالیکہ وہ کچھ دور بھی نہ ہوگی)۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ (۱۴)

تمام شرطوں کا جواب

اوپر جتنے "اِذَا" گزرے ہیں یہ ان سب کا اکٹھے جواب ہے۔ یعنی جب یہ یہ احوال پیش آئیں گے تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ وہ اپنے رب کے آگے پیش کرنے کے لیے کیا لے کر آئی ہے۔ اس جاننے سے مقصود ظاہر ہے کہ اس کے انجام کو جاننا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آج کے حالات میں اس کا مذاق اڑا رہے ہیں وہ مذاق اڑا لیں لیکن یاد رکھیں کہ یہ دن آنے والا ہے اور ایک عظیم ہلچل کے ساتھ آنے والا ہے اور اس دن ہر ایک دیکھ لے گا کہ اس کے لیے اس نے کیا تیاری کی اور کیا چیز نظر انداز کی درآنحالیکہ وہ کرنے کی تھی۔ آگے والی سورہ میں، جو اس کی توام سورہ ہے، یہی مضمون زیادہ وضاحت سے بیان ہوا ہے۔ فرمایا ہے، "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ" (الانفطار-۸۲: ۵) (تب ہر ایک جان لے گا اس نے کیا کیا اور کیا چھوڑا)۔

فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۙ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۙ وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ۙ وَالصُّبْحِ

اِذَا تَنَفَّسَ ﴿١٨﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۱۵-۱۹)

قرآن کی تکذیب کے لیے ایک اشغلہ

یہ انذار کا مذاق اڑانے والوں کے اس وہم کی تردید ہے جو انھوں نے اللہ کے رسول اور اس کی کتاب سے متعلق ایجاد کیا اور جس کو دلیل بنا کر انھوں نے اپنے عوام کو ورغلانے کی کوشش کی کہ وہ قرآن کو کوئی خدائی وحی سمجھ کر اس سے مرعوب یا متاثر نہ ہوں۔ انھوں نے جب دیکھا کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے متاثر ہو رہے ہیں اور عذاب و قیامت کا ڈراوا ایک حقیقت بنتا جا رہا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکل سکتا ہے کہ وہ اس دعوت کے حامی بن جائیں تو انھوں نے ان کو اس سے بدگمان کرنے کے لیے یہ اُشغلہ ایجاد کیا کہ نہ یہ قرآن خدائی وحی ہے اور نہ اس کے پیش کرنے والے اللہ کے رسول ہیں بلکہ یہ ہمارے کاہنوں کی طرح کے ایک کاہن ہیں جس طرح کاہنوں کا تعلق جنات سے ہوتا ہے جو ان پر غیب کی باتیں القاء کرتے ہیں اسی طرح ان کا رابطہ بھی (العیاذ باللہ) کسی شیطان سے ہے جو ان پر اپنی باتیں القاء کرتا ہے اور وہ اس کو خدائی وحی کے نام سے پیش کرتے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں جن کو اس نے ہمارے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ ہم ان کی اطاعت کریں اور اگر ہم نے ان کی بات نہ مانی تو اس دنیا میں بھی ہم پر عذاب آ جائے گا اور اس کے بعد آخرت میں بھی ہمارے لیے جہنم تیار ہے۔

قرآن نے ان کے اس پراپیگنڈے کی جگہ جگہ تردید کی ہے۔ خاص طور پر سورۂ شعراء اور سورۂ نجم میں اس کی تردید پوری وضاحت سے ہوئی ہے اور ہم نے بھی اس کے تمام پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ یہاں بھی ان کے اسی پراپیگنڈے کی تردید ایک نئے پہلو سے ہے جس کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے عربوں میں مروّج کہانت کی اصل و بنیاد کو جان لینا ضروری ہے۔

اس کہانت کی بنیاد دو چیزوں پر تھی:

کہانت کی بنیاد دو چیزوں پر تھی

ایک تو ان کے مزعومہ علم نجوم پر۔ وہ ستاروں کے متصرّف بالذّات ہونے کے معتقد اور ان میں سے بعض کے سعد اور بعض کے نحس ہونے کے مدعی تھے۔ اسی طرح ان کے طلوع و غروب، ان کے گرنے اور چڑھنے اور ان کے چلنے اور چھپنے کے متعلق مختلف قسم کے اوہام انھوں نے ایجاد کر رکھے تھے جن کی بنیاد پر وہ اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے مختلف قسم کی مبارک یا منحوس پیشین گوئیاں کرتے اور اپنی غیب دانی کی دھونس جماتے۔ مثلاً بسا اوقات یہ افواہ پھیلا دیتے کہ فلاں ستارے کی الٹی گردش سے ایک بڑا خطرہ ظہور میں آنے والا ہے اس سے بچنے کی تدابیر معلوم کرنے کے لیے لوگ ان سے رجوع کریں۔ پھر جو بدقسمت ان کے دام میں آ جاتے ان کو وہ اچھی طرح بے وقوف بناتے۔

دوسری یہ کہ وہ جنات سے رابطہ رکھنے اور ان کے ذریعے سے غیب کی خبریں معلوم کرنے کے مدعی تھے۔ سورۂ شعراء کی تفسیر میں وضاحت ہو چکی ہے کہ جب کوئی شخص ان سے کسی معاملے میں غیبی رہنمائی کا

طالب ہوتا تو وہ اس مقصد کے لیے مراقبہ کی نمائش کرتے اور پھر ایک مقفٰی اور مسجّع کلام کی صورت میں جو اکثر بے معنی یا ذو معانی ہوتا، اپنی مزعومہ وحی پیش کر کے اس کے کچھ الٹے سیدھے معنی بیان کرتے اور دعویٰ کرتے کہ یہ وحی ان پر عالم غیب کے اسرار سے واقف ایک جن نے کی ہے۔

کہانت کے ستونوں پر قرآن کی ضرب

قرآن نے جگہ جگہ کہانت کے ان دونوں ہی ستونوں پر ضرب لگائی ہے۔ شمس و قمر اور ستاروں کے طلوع و غروب کو اس نے اس طرح پیش کیا ہے جس سے یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ ان میں سے کوئی متصرف بالذات ہے اور نہ کوئی سعد یا نحس بلکہ ان کا طلوع و غروب خالقِ کائنات کے اختیار میں ہے۔ وہی جب چاہتا ہے ان کو مطلع پر نمودار کرتا ہے اور جب چاہتا ہے ان کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ وہ خود اپنے وجود سے شہادت دیتے ہیں کہ وہ آسمان و زمین کے رب کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ اسی کے حکم سے آتے اور اسی کے حکم سے جاتے ہیں۔ ع

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

سورۂ انعام آیات ۷۵ - ۸۳ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا جو تدریجی ارتقاء نمایاں فرمایا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہ اس باب میں قرآن کے طریق استدلال اور اس کے منطقی نتیجہ کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔

اسی طرح کہانت کے دوسرے ستون پر ضرب لگانے کے لیے قرآن نے شہاب ثاقب کا حوالہ دیا اور واضح فرمایا ہے کہ کسی جن کے لیے ملأ اعلیٰ تک رسائی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے وہ ٹوہ لگاتے ہیں تو ان کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ستاروں کے اندر یہ انتظام کر رکھا ہے کہ ان کی برجیوں سے ان کے اوپر شہاب ثاقب کے راکٹ پھینکے جاتے ہیں۔ یہ مضمون یوں تو جگہ جگہ بیان ہوا ہے لیکن زیر بحث قسموں کو سمجھنے کے لیے سورۂ نجم اور سورۂ جن کی متعلق آیات پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہوگا۔

اس تمہید کی روشنی میں اب آیات کے الفاظ اور ان کے معانی پر غور کیجیے۔

آیاتِ قسم کے الفاظ کی تحقیق

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۝ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ: یہ بحث اس کتاب میں جگہ جگہ گزر چکی ہے کہ قرآن مجید میں اس طرح کی قسمیں جو آئی ہیں وہ کسی دعوے پر شہادت کے مقصد سے آئی ہیں اور یہ بات بھی واضح کی جا چکی ہے کہ قسم سے پہلے اگر اس طرح 'لَا' آیا ہے جس طرح یہاں ہے تو وہ قسم کی نفی کے لیے نہیں بلکہ مخاطب کے اس زعم کی نفی کے لیے آیا ہے جس کی تردید اس قسم سے مقصود ہے۔

'خُنَّس'، جمع ہے 'خَانِس' کی۔ اس کے معنی آگے بڑھ کر پیچھے پلٹ جانے والے، ظاہر ہو کر غائب ہو جانے والے اور نمایاں ہو کر روپوش ہو جانے والے کے ہیں۔ یہ لفظ ستاروں کی صفت کے طور

پر آتا ہے اور ان کے لیے اس قدر معروف ہے کہ بسا اوقات موصوف کے ذکر کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مجرّد صفت ہی موصوف کو ظاہر کر دینے کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ بعض اہلِ لغت نے اس کو بعض خاص ستاروں کے ساتھ مخصوص کیا ہے لیکن یہ دعویٰ بے دلیل ہے۔ یہاں ستاروں کی جو صفات مذکور ہوئی ہیں وہ تمام ستاروں پر یکساں منطبق ہوتی ہیں خواہ وہ ثوابت ہوں یا سیّارے، زحل ہو یا عطارد اور ان کے قبیل کے دوسرے ستارے۔

'اَلْجَوَارِ الْکُنَّسِ' یہ انہی ستاروں کی مزید صفات کا بیان ہے اور ان کا بغیر حرفِ عطف کے آنا عربیّت کے اس معروف قاعدے سے، جس کی وضاحت اس کے محل میں گزر چکی ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے موصوف الگ الگ نہیں ہیں۔

'جَوَارِیْ' کے معنی چلنے والے کے ہیں اور 'کُنَّسٌ' جمع ہے 'کَانِسٌ' کی۔ 'کنس الظبی' کے معنی ہوں گے ہرن اپنے مامن میں چھپ گیا۔ 'کنست النجوم' کے معنی ہوں گے کہ ستارے اپنے مدار میں چلے اور چل کر اپنے ٹھکانوں میں روپوش ہو گئے۔ صاحبِ اقرب الموارد نے وضاحت کی ہے کہ یہ صفت تمام ستاروں کی مشترک صفت ہے۔

ستاروں کی قسم کہانت کے ابطال کے پہلو سے

ستاروں کی یہ قسم یہاں کہانت کے ابطال کے لیے کھائی گئی ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ کاہنوں کے مزعومہ علمِ غیب کی بنیاد دو چیزوں پر تھی۔ ایک ان ستاروں کے مؤثر بالذّات ہونے کے تصوّر پر، دوسرے اس وہمِ باطل پر کہ آسمانوں کے اندر ایسے ٹھکانے (مقاعد للسمع) ہیں جن میں بیٹھ کر جنّات غیب کی باتیں سنتے اور پھر ان کو پہنچاتے ہیں۔ ستاروں کی مذکورہ صفات کا حوالہ دے کر قرآن نے ان کے ان دونوں باطل تصورات کی نفی کر دی۔ طلوع کے بعد ان کے غروب اور آنے کے بعد ان کے جانے اور اس طلوع و غروب اور ذہاب و ایاب میں اوقات کی ایسی پابندی کہ منٹ اور سیکنڈ کا بھی فرق نہ پیدا ہونے پائے اس امر کی نہایت واضح شہادت ہے کہ وہ اس کائنات کے نظام میں مؤثر بالذّات عناصر کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ایک بالاتر حکیم و قدیر کے ہاتھوں میں مسخّر ہیں۔ اس وجہ سے اصل مولیٰ و مرجع اور نافع و ضارّ وہ ہے نہ کہ یہ محکوم و مقہور کواکب و نجوم۔

دوسرے وہم کے ابطال کے لیے قرآن نے اس کائنات کے ایک راز کو آشکارا فرمایا ہے کہ ان ستاروں کے اندر شیاطین کے استراقِ سمع اور تجسسِ غیب کے لیے ٹھکانے نہیں بنے ہوئے ہیں، جیسا کہ نادانوں نے گمان کر رکھا ہے، بلکہ اس کے برعکس ان کے اندر ایسی برجیاں اور دیدبان بنے ہوئے ہیں جہاں سے ان شیاطین پر مار پڑتی ہے جو ملأ اعلیٰ کی باتوں کی ٹوہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ستاروں کی یہ صفتیں یہاں قسم کے اسلوب میں بیان ہوئی ہیں اس وجہ سے بتقاضائے بلاغت ان میں غایت درجہ ایجاز ہے۔ تاہم الفاظ کے اندر ایسے اشارے یہاں بھی موجود ہیں جو غور کرنے والوں

کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں، مثلاً 'خُنَّس' کی صفت واضح طور پر ان کے افول و غروب کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ اس صفت کے ذکر سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ نادانوں نے صرف ان کے طلوع کو اہمیت دی اور ان کو معبود بنا بیٹھے حالانکہ ان کی پسپائی اور ان کے ڈوبنے کو بھی دیکھنا تھا جو ان کے محکوم و مسخّر ہونے کی نہایت واضح دلیل ہے۔

اسی طرح 'الْجَوَارِ الْکُنَّسِ' کے اندر ایک ہلکا سا اشارہ اس نقل و حرکت کی طرف بھی ہے جو یہ ستارے شیاطین کے تعاقب میں کرتے ہیں جب وہ استراقِ سمع کی کوشش کرتے نکلتے ہیں تو اس وقت ستاروں کا منظر دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ ایک برقِ خاطف تیر کی طرح نکلی اور اپنے ہدف پر پہنچ کر دفعۃً پھر اپنے ترکش میں چھپ گئی۔

وَالَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۝ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (۱۷-۱۸)

یہ دوسری قسم ہے جو اسی دعوے پر ایک دوسرے پہلو سے شہادت ہے۔

'عَسْعَسَ' کے معنی اہلِ لغت نے تاریک ہو جانے کے بھی لکھے ہیں اور پیچھے ہٹ جانے اور گزر جانے کے بھی۔ اگرچہ آیت کی تاویل دونوں معنوں کی روشنی میں ہو سکتی ہے لیکن میں دوسرے معنی کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعینہٖ یہی قسم، بالکل اسی سیاق و سباق اور معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ، سورۂ مدثر کی آیات ۳۳-۳۴ میں بھی آئی ہے۔ وہاں 'عَسْعَسَ' کی جگہ لفظ 'اَدْبَرَ' آیا ہے۔ فرمایا ہے: 'وَالَّیْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ' (شاہد ہے رات جب کہ وہ پیچھے ہٹ جاتی ہے اور شاہد ہے صبح جب کہ وہ بے نقاب ہو جاتی ہے) وہاں بھی اس قسم کے بعد قرآن مجید کے انذارِ قیامت کی حقانیت ثابت کی گئی ہے اور یہاں بھی، جیسا کہ آگے وضاحت آ رہی ہے، اسی دعوے کی تصدیق فرمائی گئی ہے۔

'وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ' میں لفظ 'تَنَفَّسَ' سے مقصود تو صبح کا نمودار ہونا ہی ہے لیکن اس طریقۂ تعبیر میں ایک خاص بلاغت ہے جو اصحابِ ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ یہ لفظ گویا یہ تاثر دیتا ہے کہ صبح رات کے بوجھ کے نیچے اس طرح دبی ہوتی ہے کہ اس کا دم گھٹ رہا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اوپر سے اس بوجھل لحاف کو سرکاتا ہے اور اس کو سانس لینے اور سر اٹھانے کا موقع نصیب ہوتا ہے۔

اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ (۱۹)

یہ مذکورہ بالا دونوں قسموں کا مقسم علیہ یا بالفاظِ دیگر وہ اصل دعویٰ ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں۔ فرمایا کہ بے شک یہ قرآن ایک معزز و مکرّم فرستادۂ الٰہی کا لایا ہوا کلام ہے۔ 'رسول' سے یہاں مراد حضرت جبریلؑ ہیں۔ آگے جو صفات بیان ہوئی ہیں اور جن کی وضاحت آ رہی ہے ان سے متعیّن ہو جائے گا کہ ان صفات کے موصوف حضرت جبریل علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں۔ اصل دعویٰ

یہی بات آگے آیت ۲۵ میں منفی پہلو سے بھی فرمادی گئی ہے جس سے لفظ کریم کا اصل موقع و محل واضح ہوتا ہے۔ فرمایا ہے: وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ (اور یہ کسی راندۂ درگاہ شیطان کی القاء کی ہوئی بات نہیں ہے) مطلب یہ ہے کہ محروم القسمت ہیں وہ لوگ جو اس قرآن کو کاہنوں کی بکواس کی قسم کی کوئی چیز قرار دیتے اور اللہ کے رسول کو کاہن کہتے ہیں۔ کاہن جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ شیطانی القاء ہوتا ہے جس میں صداقت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ غیب دانی کے مدعی ہوتے ہیں لیکن ان کے شیاطین کی رسائی ملاءِ اعلیٰ تک ہونا تو درکنار وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے مردود و مبغوض ہیں کہ وہ آسمانوں میں گھات لگانے کی کوشش کرتے ہیں تو ان پر شہابوں کے ذریعے سے سنگ باری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس یہ کلام جو ان کو سنایا جا رہا ہے یہ اللہ کے ایک ایسے فرستادہ کا لایا ہوا کلام ہے جو خدا کی بارگاہ میں عزت پائے ہوئے اور نہایت مقرب و مکرم ہے۔

ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝ (۲۰-۲۱)

حضرت جبریلؑ کی مزید صفات

یہ حضرت جبریل امینؑ کی مزید صفات بیان فرمائی گئی ہیں تاکہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ قرآن کس محفوظ و مامون اور پاکیزہ ذریعہ سے اترا ہوا کلام ہے اور کاہن جس ذریعہ سے اپنا مزعومہ علم حاصل کرتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے۔ فرمایا کہ یہ باعزت رسول نہایت زور و قوت والا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسی اعلیٰ اور محکم صلاحیتوں سے نوازا ہے کہ دوسری شیطانی طاقتیں اس کو مرعوب یا مغلوب یا متاثر نہیں کر سکتیں کہ اس کے فرائضِ مفوّضہ میں وہ مزاحم ہو سکیں یا اس سے کوئی چیز اچک سکیں یا اس کو دھوکہ دے سکیں۔ وہ صاحبِ عرش کے احکام پورے اختیار و اقتدار کے ساتھ نافذ کرتا ہے اس لیے کہ وہ اس کی بارگاہ میں نہایت تقرب اور رسوخ رکھنے والا ہے۔ اس کو صاحبِ عرش تک براہِ راست رسائی حاصل ہے کوئی دوسرا اس کے اور صاحبِ عرش کے درمیان حائل نہیں ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کی یہی صفت سورۂ نجم کی آیات ۵-۶ میں 'شَدِيْدُ الْقُوٰى' اور 'ذُوْ مِرَّةٍ' کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے جس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

'مُطَاعٍ' یعنی جو ارواح و ملائک اس کی ماتحتی میں ہیں وہ سب بے چون و چرا اس کی اطاعت کرتے ہیں، مجال نہیں ہے کہ سرِ مو اس کے احکام سے انحراف کر سکیں یا اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکیں یا اس کے دیے ہوئے احکام میں کوئی تحریف یا ترمیم یا شیاطین کے ساتھ کوئی ساز باز کر سکیں۔

'ثَمَّ' کی تحقیق

'ثَمَّ اَمِيْنٍ' کلامِ عرب کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ 'ثَمَّ' اور 'ثُمَّ' کے مواقعِ استعمال میں بڑا فرق ہے۔ 'ثَمَّ' کسی جگہ کی طرف خاص طور پر اشارہ کے لیے بھی آتا ہے اور کسی صفت سے پہلے اس پر خاص اہتمام سے زور دینے کے لیے بھی، مثلاً سورۂ شعراء میں فرمایا ہے: وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ (۶۴)

اس کا ترجمہ اگر تَنَفَّسَ کے صحیح مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیجیے تو یہ ہوگا کہ وہیں ہم لائے دوسروں کو بھی۔ یعنی جس راہ سے ہم نے بنی اسرائیل کو نجات دی وہیں ہم فرعونیوں کو بھی لائے تاکہ ان کو غرق کر دیں۔

اسی طرح سورۂ دھر کی آیت وَاِذَا رَاَیۡتَ ثَمَّ رَاَیۡتَ نَعِیۡمًا وَّمُلۡکًا کَبِیۡرًا (۲۰) میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ اس کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ ہمارے نزدیک یہ ہوگا کہ جہاں دیکھو گے وہیں عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی دیکھو گے؛ ع

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

اسی طرح صفت سے پہلے جب یہ آتا ہے تو اس کی عظمت و اہمیت کو نمایاں کرنے کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ صفت 'امین' سے پہلے آیا ہے تو اس سے مقصود حضرت جبریل علیہ السلام کی اس صفت کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا ہے۔ یعنی مذکورہ صفات کے ساتھ ان کی خاص اہمیت رکھنے والی یا خاص طور پر ذکر کے لائق صفت یہ بھی ہے کہ وہ نہایت امانت دار ہیں۔

اس صفت کے خاص اہتمام کے ساتھ ذکر کی وجہ یہ ہے کہ ان کی یہی صفت اس امر کی ضمانت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول کے پاس جو کچھ لاتے ہیں اس میں نہ کسی ملاوٹ کا کوئی شائبہ ہوتا نہ کسی کمی بیشی کا کوئی اندیشہ۔ اس کے برعکس کاہنوں کے علم کا حال یہ ہے کہ وہ جن شیاطین سے علم حاصل کرتے ہیں وہ اچکے اور چور ہوتے ہیں۔ اول تو ملاءِ اعلیٰ تک وہ پہنچ نہیں پاتے اور اگر کوئی بات اچکنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ یکسر جھوٹ ہوتی ہے جس میں مزید جھوٹ ملا کر وہ اپنے کاہنوں پر القا کرتے ہیں اور یہ کاہن ان سے بھی بڑھ کر جھوٹے ہوتے ہیں جو اپنی دکان داری کو فروغ دینے کی خاطر رائی کو پربت بناتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس ناپاک جوہڑ کو اس چشمۂ صافی سے کیا نسبت جس سے اللہ کا رسول فیض یاب ہوتا ہے!

وَمَا صَاحِبُکُمۡ بِمَجۡنُوۡنٍ (۲۲)

قریش کو تنبیہ

رسول کے ذریعۂ علم کی عظمت و طہارت واضح کرنے کے بعد یہ قریش کے لیڈروں کو مخاطب کر کے تنبیہ فرمائی کہ تمھارے یہ ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے تمھیں انذار کرنے پر مامور فرمایا ہے اور جو کچھ وہ تمھیں سنا رہے ہیں وہ اس کا کلام ہے جو اس نے اپنے سب سے زیادہ مقرب فرشتے کے ذریعہ سے ان پر نازل فرمایا ہے تو ان کی ان باتوں کو خبط و جنون پر محمول نہ کرو بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔

یہاں لفظ صَاحِبُکُمۡ کے استعمال میں بڑی بلاغت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تمھارے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں۔ تمھارے ہی اندر یہ پیدا ہوئے، تمھارے ہی ساتھ یہ رہے سہے اور تمھارے ہی

اندر ان کی اب تک کی زندگی کا ہر دور گزرا اور تم میں سے ہر شخص ان کی شرافت، رزانت، متانت، عفّت، صداقت اور امانت کا گواہ رہا ہے۔ اب اگر ان کی کوئی بات تمھیں گراں گزر رہی ہے تو ان کے اب تک کے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرو نہ کہ ان کو خبطی، دیوانہ مجنون اور کاہن و منجّم بنا ڈالو۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ (۲۳)

یعنی اگر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اس فرشتہ کو دیکھا ہے جو ان پر وحی لے کر آتا ہے تو یہ بھی کوئی جھوٹ یا فریبِ نفس نہیں ہے بلکہ بیانِ حقیقت ہے۔ انھوں نے فی الواقع اس فرشتے کو بالکل کھلے ہوئے اور صاف افق میں دیکھا ہے۔ 'افقِ مبین' سے مراد فضائے آسمانی کا وہ حصہ ہے جو نظر کے سامنے ہے، جس کا مشاہدہ بغیر کسی شائبۂ اشتباہ کے ہوتا ہے۔ سورۂ نجم میں اسی کو 'افقِ اعلیٰ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ	اس کو ایک بڑی مضبوط قوتوں والے، طاقتور
ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۙ وَهُوَ	نے تعلیم دی ہے۔ وہ سیدھا ہوا درآنحالیکہ وہ
بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۭ ثُمَّ دَنَا	افقِ اعلیٰ میں تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور جھک پڑا۔
فَتَدَلّٰى ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ	پس دو کمانوں یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا
اَوْ اَدْنٰى ۚ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ	پس اللہ نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی
اَوْحٰى ۭ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ؟	کی۔ یہ مشاہدہ جو اس نے کیا وہ کوئی فریبِ نفس
اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ؟	نہیں ہے۔ تو کیا تم لوگ اس سے اس چیز پر
(النجم - ۵۳ : ۵ - ۱۲)	جھگڑتے ہو جس کا اس کو مشاہدہ ہوتا ہے۔

ان آیات کی تفسیر تدبرِ قرآن میں پڑھ لیجیے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مشاہدات کی طرف اشارہ ہے جو آپ کو آغازِ وحی میں ہوئے۔ جب آپ نے ان کا ذکر اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے کیا تو وہ آپ کے سر ہو گئے اور اس کی تردید میں طرح طرح کی باتیں انھوں نے بنائیں۔ کسی نے اس کو شیطانی القاء قرار دیا اور کسی نے محض واہمہ کی خلاقی۔ انہی جھٹلانے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ نہ یہ کوئی فریبِ نفس ہے اور نہ فریبِ نظر بلکہ یہ کھلے ہوئے افق کا ایک ایسا مشاہدہ ہے جس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ (۲۴)

اللہ کا رسول غیب کا حریص نہیں ہے — یعنی ہمارا رسول تمھارے کاہنوں کی طرح غیب کا حریص نہیں ہے کہ جو واہمہ دل میں گزر جائے اس کو حقیقت سمجھ کر غیب دانی کا مدعی بن بیٹھے اور اپنی دکان سجا لے بلکہ اس کو جو مشاہدہ ہوتا ہے یا جو وحی اس پر آتی ہے وہ اضطراری طور پر آتی ہے جس کو وہ تمھارے سامنے پیش کرتا ہے۔ تمھارے

کاہن غیب جاننے کے لیے نہ جانے کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں اور اسی پر ان کی دکان داری کا انحصار ہوتا ہے اس وجہ سے کوئی سچی چیز ہاتھ نہیں آتی تو جھوٹ ہی سے اپنی دکان چمکاتے ہیں لیکن اپنے اس ساتھی کے متعلق تمھیں اچھی طرح علم ہے کہ وہ ان چیزوں کے پیچھے کبھی نہیں پڑے - یہ جو کچھ تمھارے آگے پیش کر رہے ہیں یہ غیب دانی کی نمائش یا جلبِ زر کا کوئی بہانہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت کا اظہار ہے جس کے اظہار پر وہ مضطر ہیں -

'ضَنِیْنٌ' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے 'بخیل' کیا ہے لیکن میں نے حریص کیا ہے۔ بخل و حرص دونوں لازم و ملزوم ہیں اس وجہ سے ان میں فرق محض ظاہری ہے لیکن میں نے حرص کے معنی کو اس وجہ سے ترجیح دی ہے کہ لفظ 'ضَنٌّ' بخل کے معنی میں جب آتا ہے تو اس کا صلہ 'ب' آتا ہے اور یہاں 'عَلٰی' آیا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ 'حرص' کے معنی پر متضمن ہے -

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ (۲۵)

اوپر جو بات 'اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ' کے الفاظ میں فرمائی ہے وہی بات یہ منفی پہلو سے مؤکد کر دی ہے کہ یہ کسی شیطانِ رجیم کا القا نہیں ہے جو تمھارے کاہنوں پر ہوتا ہے -

'رَجِیْمٌ' مقابل ہے 'كَرِیْمٌ' کے - مطلب یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جو فرشتہ وحی لے کر آتا ہے وہ تو اللہ کا ایک عالی مقام فرشتہ ہے اور تمھارے کاہنوں پر جو شیاطین اترتے ہیں وہ کھدیڑے اور راندے ہوئے ہیں - 'رَجِیْمٌ' کے معنی سنگسار کیے ہوئے کے ہیں - ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ جو شیاطین آسمانوں میں غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے چھپنے کی کوشش کرتے ہیں ان پر شہابوں کے ذریعہ سے سنگ باری ہوتی ہے اس وجہ سے 'رجیم' ان کی مستقل صفت ہے -

فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ (۲۶)

یہ ان ہٹ دھرموں کی کج ذوقی اور ہٹ دھرمی پر اظہارِ تعجب ہے کہ کہاں یہ قرآن اور کہاں تمھارے کاہنوں اور شیاطین کی خرافات - دونوں میں کیا نسبت! آخر تم ضد کے جنون میں کہاں سے کہاں نکل جاتے ہو کہ گہر اور پشیز میں فرق نہیں کر پاتے -

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ (۲۷-۲۸)

یہ آخر میں نہایت مؤثر تنبیہ و موعظت ہے - مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا والوں کے لیے اس وقت کے ظہور سے پہلے یاد دہانی ہے جو بہر حال آنے والا ہے اور جس سے کسی کے لیے مفر نہیں ہے اگر تم اس کو قبول کرو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، کسی دوسرے پر احسان نہیں کرو گے اور یہ بھی یاد رکھو کہ اس کو قبول کرنا یا رد کرنا تمھاری اپنی ہی ذمہ داری ہے خدا یا اس کے رسول کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اس کو تمھارے دلوں میں اتار دیں تو جس کو اپنی راہ سیدھی کرنی ہو وہ سیدھی کر لے ورنہ

اپنی کج روی کے اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہے جس سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۹)

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کا حوالہ دیا ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے باب میں ٹھہرا رکھی ہے کہ وہ ہدایت کی توفیق انہی کو بخشتا ہے جو اس کے طالب بنتے اور اس کے لیے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہیں۔ جو اندھے بہرے ہو کر زندگی گزارتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ان کی پسند کردہ ضلالت ہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا کرتا ہے۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ سورۂ مدثر کی آخری آیات کے تحت بھی اس کی وضاحت ہوئی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

بتوفیقِ ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فللّٰہ الحمد علیٰ احسانہٖ۔

رحمان آباد

۱۷- جولائی ۱۹۷۹ء

۲۱- شعبان ۱۳۹۹ھ